ڈاکٹر تقدیس زہرا
ایسوسی ایٹ پروفیسر، گورنمنٹ جناح ڈگری کالج، لاہور

Dr. Taqdees Zahra
Associate Professor, Govt.Jinnah Degree College, Lahore

نشاطِ خواب۔ ناصر کاظمی کی منفرد مثنوی

Nishat-e-Khawb, A Unique Masnavi of Nasir Kazmi

Abstract: Nasir Kazmi has written such an amatory verses that attract towards them very eagerly. References have been given in the manuscript. The poet has remained successful in saying some odes which depend upon bitter experiences of daily life. Sometime he converts ode into poem artfully and never loses its fluency. These poems recall us the scenes and patches of old literature. He has full perfection in sketching description of human figures. If he inclined towards "Masnavi" he would surely show wonders but this verse this verse "Nishat-e-Khawb" is his master piece also, which has no deficiency but effiency from every corner.

Key Words: References, manuscript, literature, sketching, Masnavi

ناصر کاظمی اتنی عمدہ غزل کہہ گیا ہے کہ یہ ادا کسی اور سمت دھیان کو جانے ہی نہیں دیتی ورنہ اس کی پٹاری میں نظموں کے روشن سنگ ریزے بھی تھے جو اندھیرے میں جگنوؤں کی مانند چمکتے تھے مگر اس کی غزل نے ایسی چکا چوند مچا رکھی ہے کہ اور کچھ سجھائی ہی نہیں دیتا۔ ان نظموں کو خود ناصرؔ نے بھی نظر انداز کر رکھا تھا لیکن یہ بھی ہے کہ اس کی بعض غزلوں کے ٹکڑوں پر بھی نظم کا دھوکا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے یہ چند مثالیں:

او میرے مصروف خدا　　　اپنی دنیا دیکھ ذرا
اتنی خلقت کے ہوتے　　　شہروں میں ہے سنّاٹا
خاک اڑاتے ہیں دن رات　　　مِیلوں پھیل گئے صحرا
سورج سر پر آ پہنچا　　　گرمی ہے یا روزِ جزا
پیاسی دھرتی جلتی ہے　　　سُوکھ گئے بہتے دریا
فصلیں جل کر راکھ ہوئیں　　　نگری نگری کال پڑا
او میرے مصروف خدا　　　اپنی دنیا دیکھ ذرا (۱)

بطور خاص وہ غزلیں جن میں ہجرت کا دکھ جھلکتا ہے وہ تو مسلسل غزلوں کا عمدہ نمونہ ہیں۔ مثلاً ''برگِ نے'' کی یہ غزلیں:

۱۔ ع شہر در شہر گھر جلائے گئے

۲۔ ع یہ شب یہ خیال و خواب تیرے

۳۔ ع کسے دیکھیں کہاں دیکھا نہ جائے

۴۔ ع گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ

۵۔ ع نصیب عشق دلِ بے قرار بھی تو نہیں

علاوہ ازیں بہت سی وہ غزلیں جن میں ہجرت کا ذکر نہیں اور رومان کی ہلکی ہلکی لہریں نرم ہلکورے سے لیتی نظر آتی ہیں۔ ان میں تسلسل ان غزلوں کے تاثر کو اور بڑھا دیتا ہے۔ مثال کے طور پر:

۱۔ ع ٹھہرا تھا وہ گل عذار کچھ دیر

۲۔ ع دن ڈھلا رات پھر آ رہی سو رہو سو رہو

۳۔ ع بسا ہوا خیالوں میں کوئی پیکرِ ناز

۴۔ ع دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا

۵۔ ع خیال ترکِ تمنا نہ کر سکے تو بھی

۶۔ ع کسی کلی نے بھی دیکھا نہ آنکھ بھر کے مجھے

۷۔ ع کون اس راہ سے گزرتا ہے

پھر وہ غزلیں بھی ہیں جن میں زندگی کے تلخ حقائق کا بیان ہے اور یہ طویل غزلیں ہیں جن میں بہت سے مسلسل اشعار کہنا آسان ہو جاتا ہے چنانچہ اس امتحان میں بھی ناصر کامیاب رہے۔ مثلاً یہ غزلیں:

۱۔ ع سازِ ہستی کی صدا غور سے سُن

۲۔ ع دُور اس تیرہ خاک دان سے دور

۳۔ ع کچھ تو احساسِ زیاں تھا پہلے

۴۔ ع مسلسل بے کلی دل کو رہی ہے

۵۔ ع رہ نوردِ بیابانِ غم صبر کر صبر کر

بلکہ دیوان میں شامل ایک خوب صورت غزل تو ''نشاطِ خواب'' کی تمہید معلوم ہوتی ہے اور تسلسل نے اس غزل کو منفرد بنا دیا ہے:

سناتا ہے کوئی بُھولی کہانی — مہکتے، میٹھے دریاؤں کا پانی
یہاں جنگل تھے آبادی سے پہلے — سنا ہے میں نے لوگوں کی زبانی
یہاں اک شہر تھا شہرِ نگاراں — نہ چھوڑی وقت نے اس کی نشانی
میں وہ دل ہوں دبستانِ الم کا — جسے روئے گی صدیوں شادمانی

خیالوں ہی میں اکثر بیٹھے بیٹھے بسا لیتا ہوں اک دنیا سہانی
کرن پریاں اترتی ہیں کہاں سے کہاں جاتے ہیں رستے کہکشانی
پہاڑوں سے چلی پھر کوئی آندھی اڑے جاتے ہیں اوراقِ خزانی (۲)

اور دیکھیے چند صفحات پلٹنے سے پھر کوئی نہ کوئی مسلسل غزل نظر کے سامنے آجاتی ہیں۔ان مسلسل غزلوں کے پہلے مصرعے یہاں درج کر رہی ہوں:

ا۔ ع دکھ کی لہر نے چھیڑا ہو گا
۲۔ ع اِن سہمے ہوئے شہروں کی فضا کچھ کہتی ہے
۳۔ ع آج تو بے سبب اداس ہے جی
۴۔ ع گا رہا تھا کوئی درختوں میں
۵۔ ع دیارِ دل کی رات میں چراغ سا جلا گیا
۶۔ ع کُنج کُنج نغمہ زن بسنت آ گئی

اور یہ چار غزلیں تو صاف صاف سقوطِ ڈھاکا کے سانحے کی طرف اشارا کرتی ہی ہیں مگر ناصر نے کمالِ فن سے اس واقعہ کو غزل میں نظم کی صورت سمیٹا ہے۔پوری پوری غزلیں مشرقی پاکستان کے قدرتی حسن اوراس کے لمحہ بہ لمحہ الم ناک سقوط کی طرف دھیان دلاتی ہیں:

ا۔ ع جنت ماہی گیروں کی
۲۔ ع دیس سبز جھیلوں کا
۳۔ ع دھواں سا ہے جو یہ آکاش کے کنارے پر
۴۔ ع وہ ساحلوں پہ گانے والے کیا ہوئے

اور پھراس غزل کو تو کوئی فراموش کر ہی نہیں سکتا:

ع گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ

لیکن یہ غزل کے منفرد نمونے ہیں جنھیں شاید ناصر نے تجرباتی طور پر کہاتاہم زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ یہ سب جذبوں کی شدت کا نتیجہ ہیں۔ان غزلوں نے ناصر کے فن کوایک نئی جہت عطا کی ہےاوراب ذکر ''پہلی بارش'' کا جو نظم ہے یا مسلسل غزل یہ کہنا مشکل ہے مگر ناصر کا یہ تجربہ ان اشعار کو الگ کتابی صورت میں ڈھال گیا۔اس تجربے کا حسن اور اسلوب بھی کہیں ندرت رکھتا ہے اور کہیں الجھا دیتا ہے لیکن اثرپذیری سے خالی نہیں:

> ''ناصر نے غزل کہی اور بہت عمدہ غزل کہی۔ نظم میں تجربہ کیا۔۔۔ بعد میں یہی نظم گوئی کا جذبہ ''پہلی بارش'' کی مسلسل غزلوں میں اپنا اظہار کر گیا۔ان چوبیس غزلوں کو اگر ایک تسلسل میں دیکھیں توانسانی زندگی کے طویل سفر کے سنگِ میل دکھائی دے جائیں گے۔'' (۳)

اب آیئے اصل مدعا کی طرف یعنی ''نشاطِ خواب''۔یہ ایک ایسی مختلف نظم ہے جو کسی جگہ غزل کا تاثر دیتی ہے اور کسی جگہ قدیم مثنویوں اور

داستانوں کا انداز لیے ہوئے ہے۔ اس طویل نظم کو پڑھ کر کلاسیکی عہد کی بہت سی اردو مثنویوں اور داستانوں کی یاد آتی ہے:

"وہ نہ صرف لفظوں کا خوب صورت استعمال کرتے ہیں بلکہ کتنے ہی لفظوں کو نیا پن دے کر انھیں تازہ دم کرتے جاتے ہیں۔ پھر خوب صورت تشبیہیں بھی ہیں اور کہیں کہیں حسین اور نازک خیال بھی۔ "نشاطِ خواب" پر قدیم داستانوں کا اثر صاف ظاہر ہوتا ہے۔" (۴)

اس نظم کا آغاز کچھ اس روانی سے ہوتا ہے کہ ناصر قاری کے دل کو گویا اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور خوب صورت لفظوں کی قوسِ قزح بکھیرتے چلے جاتے ہیں اور قاری نظم مکمل پڑھ کر ہی دم لیتا ہے:

مطلع اوّل

ہر کوچہ اک طلسم تھا ہر شکل موہنی
قصّہ ہے اس کے شہر کا یارو شنیدنی
تھا اک عجیب شہر درختوں کی اوٹ میں
اب تک ہے یاد اس کی جگا جوت روشنی

سچ مچ کا اک مکان پرستاں کہیں جسے
رہتی تھی اس میں ایک پری زاد پدمنی
اونچی کھلی فصیلیں، فصیلوں پہ بُرجیاں
دیواریں سنگ سرخ کی، دروازے چندنی (۵)

اور اس کے بعد منظر کشی اور جزئیات نگاری کس خوب صورتی سے شروع ہوتی ہے کہ "باغ و بہار" کے تہذیبی مرقعے اور "سحر البیان" کی جزئیات نگاری کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ لیکن سب سے پہلے اس بند کا تذکرہ جس میں کبوتروں کا ذکر ہے۔ میرا خیال ہے کہ نظیر اکبر آبادی کے بعد ناصر کاظمی ہی نے کبوتروں کا ذکر اس شدت سے کیا ہے اور ان کے رنگ اور اقسام بتائی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں کبوتروں سے خاص لگاؤ تھا:

ہر بوستان کے پھول تھے اس عیش گاہ میں
ہر دیس کے پرندوں نے چھائی تھی چھاؤنی
جھرمٹ کبوتروں کے اترتے تھے رنگ رنگ
نیلے، اُجال، جوگئے، گلدار، کاسنی
پٹ بیجنا سی انکھڑیاں گل چاندنی سے تاج
چونچوں میں خس کی تیلیاں پنجوں میں پینجنی
سارنگیاں سی بجتی تھیں جب کھولتے تھے پر
یکبار گونج اٹھتی تھی سنسان کنگنی (۶)

لیکن یہاں ذرا رکیے اور دیکھیے کہ ''سحر البیان'' کے بہت سے مناظر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، خصوصاً مرقع نگاری اور منظر کشی کے حوالے سے ۔مثال کے طور پر یہ اقتباس:

سُفید ایک دیکھی عمارت بلند — کہ تھی نور میں چاندنی سے دوچند
در و بام یک لخت سارے سُفید — ہر اک طاق، محرابِ صبحِ امید
زمیں کا طبق، آسماں کا طبق — سنہری، رُپہری ہوں جیسے ورق
ہر اک سمت واں نور کا اِژدحام — لگے آئنے قدّ آدم تمام (۷)

اس کے بعد ملاحظہ ہو اسی مثنوی کا یہ حصہ:

کہوں اس کی پوشاک کا کیا بیاں — فقط ایک پشواز آبِ رواں
زبس موتیوں کی تھی سِنجاف گلِ — کہے تو وہ بیٹھی تھی موتی میں تُل
جھلک پایجامے کی دامن سے یوں — نظر آئے آئینے میں برق جوں
وہ ترکیب اور چاند سا وہ بدن — وہ بازو پہ ڈھلکے ہوئے نو رتن
جڑاؤ دو بالے کہ ہالے کا رشک — وہ موتی کے مالے کہ عاشق کا اشک (۸)

''سحر البیان'' کے ان مناظر کے بعد ناصر کی ''نشاطِ خواب'' کو پڑھیے تو برملا کہنا پڑتا ہے کہ ناصر کاظمیؔ نے بھی کوئی کمی نہیں رکھی اور ان کی نظم کا فنی حسن اور اسلوبِ بیان نکھر کر سامنے آتا ہے۔ اگر وہ سنجیدگی سے مثنوی کہنے کی طرف دھیان دیتے تو ''سحر البیان'' کے بعد ایک اور شاہکار مثنوی اردو ادب کا حصہ بن چکی ہوتی مگر انھوں نے محض ''نشاطِ خواب'' کے ایک دانے پر ہی اکتفا کیا۔

تاہم جب وہ ''نشاطِ خواب'' میں اُس پرستان کی ایک پری کے جشنِ عروسی کا ذکر کرتے ہیں تو اس حوالے سے لباس، زیورات، انواع واقسام کے کھانوں، پھولوں، سازوں اور گیتوں کا تذکرہ بھی ہوتا ہے اور ناصر لفظوں سے تصویریں کھینچ دیتے ہیں:

کشمکش، چھوارے، کاغذی بادام، چار مغز
رکھے تھے رنگ رنگ کے میوے چشیدنی
مرغابیاں تلی ہوئیں، تیتر بُھنے ہوئے
خستہ کباب سیخ کے اور نان روغنی
صندل، کنول، سہاگ پُڑا، سہرا، عطر پھول
لائی سجا کے تھال میں اک شوخ کامنی

شیشے اُچھال اُچھال کے گاتے تھے مغبچے
بیٹھی تھی شہ نشین پہ اک دُختِ ارمنی
رقاصِ رنگ ناچتے پھرتے تھے صف بہ صف

دُولھا بنا گلال، بسنتی دلھن بنی

انگارہ سا بدن جو دمکتا تھا بار بار

گل منہ پر ڈھانپ لیتے تھے کرنوں کی اوڑھنی

ہر دانگ باجنے لگے باجے نشاط کے

مردنگ، ڈھول، تان پُرا، سنکھ سنکھنی

آکاش سے برس پڑے رنگوں کی آبشار

نیلے، سیہ، سفید، ہرے، لال، جامنی (۹)

اوراب ناصر کی اس نظم میں سراپا نگاری کے حسن کا جلوہ دیکھیے۔یوں لگتا ہے مصور کوئی تصویر کینوس پر اُتار رہا ہے:

اتنے میں ایک کفر سراپا نظر پڑا

پھرتی تھی ساتھ ساتھ لگی جس کے چاندنی

ماتھے پہ چاند، کانوں میں نیلم کی بالیاں

ہاتھوں میں سرخ چوڑیاں، شانوں پہ سوزنی

پلکیں دراز خطِ شعاعی سی تیز تیز

پُتلی ہر ایک آنکھ کی ہیرے کی تھی کنی

وہ انگلیاں شفق سی کہ ترشے ہوئے قلم

اُجلے، روپہلے گال کہ ورقے نوشتنی

کندن سا روپ، دھوپ سا چہرہ پون سی چال

دامن کشیدنی، لب و عارض چشیدنی (۱۰)

اس جگہ پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک بار پھر رک کر ذرا سی دیر کو" باغ و بہار" کے اس اقتباس پر بھی نظر ڈال لی جائے کیوں کہ اسے دیکھنے سے ناصر کاظمی کے داستانوی انداز اور کلاسیکی اسلوب کا جواز مل جاتا ہے اور کہنا پڑتا ہے کہ ناصر نے اس روایت کو بخوبی نبھایا ہے۔پہلے ملاحظہ ہو" باغ و بہار" کا اقتباس:

> "جابہ جا قمقمے، سروِ چراغاں، کنول اور فانوسِ خیال، شمعِ مجلس حیراں اور فانوسیں روشن تھیں؛ کہ شبِ برات باوجود، چاندنی اور چراغاں کے اس کے آگے اندھیری لگتی۔ایک طرف آتش بازی، پھل جھڑی، انار، داؤدی، مرواری، مہتابی، ہوائی، چرخی، ہتھ بھول، پٹاخے، ستارے چھٹتے تھے۔" (۱۱)

اور پھر صرف اسی پر کیا موقوف۔ناصر کاظمی آگے چل کر نظم میں جس جگہ مختلف کھانوں کا ذکر کرتے ہیں وہاں بھی" باغ و بہار" کی یاد تازہ ہو جاتی ہے:

"۔۔۔دستر خوان بچھا، مجھ تن تنہا کے روبرو بکاول نے اک تورے کا تورا چُن دیا۔ چار مُشقاب: ایک میں یخنی پلاؤ، دوسری میں قورما پلاؤ اور تیسری میں متنجن پلاؤ، چوتھی میں کوکو پلاؤ اور ایک قاب زردے کی۔ اور کئی طرح کے قلیے، دو پیازہ، نرگسی، بادامی اور روٹیاں کئی قسم کی: باقر خانی، تنکی، شیر مال، گاو دیدہ، گاو زبان، نان نعمت، پراٹھے اور کباب: کوفتے کے، تکے کے، مرغ کے۔ خاگینہ، ملغوبہ، شب دیگ، دم پخت، حلیم، ہریسا، سموسے ورقی، قبولی، فرنی، ملائی، حلوا، فالودہ، آب شورہ، ساقِ عروس، مربّا، اچار دان، دہی کی قلفیاں۔ یہ نعمتیں دیکھ کر روح بھر گئی۔" (۱۲)

اردو کی اس کلاسیکی روایت کو از سرِ نو زندہ کر کے ناصر کاظمی نے کمال کیا ہے۔ اس حوالے سے فنی چابک دستی سے کام لے کر انھوں نے ماحول کی تفصیلات اور جزئیات کو بیان کرتے ہوئے نظم کے سراپے میں جان ڈال دی ہے۔ سارا منظر خواب ناک دھند میں لپٹا کسی طلسمی شہر کی تصویر نظر آتا ہے۔ محل، فصیل، باغ، پرندے، درخت اور اس سارے منظر نامے میں گھومتے پھرتے، جیتے جاگتے کردار۔ گویا کسی داستان سے اس شہر کو اٹھا کے ناصر نے اس نظم کے آئینے پہ رکھ دیا ہے:

پردے اٹھا دیے تھے نگاہوں نے سب مگر
دل کو رہا ہے شکوۂ کوتاہ دامنی
اُڑ اُڑ کے راج ہنسوں نے جنگل جگا دیا
گھوڑوں کی رَتھ میں بیٹھ گئے جب بنا بنی
منہ دیکھتے ہی رہ گئے سب ایک ایک
منہ پھیر کر گزر گئی وہ راج ہنسنی
منظر مجھے ہوس نے دکھائے بہت مگر
ٹھہرا نہ دل میں حسن کا رنگِ شکستنی
تارا سحر کا نکلا تو ٹھنڈی ہوا چلی
نیند آ گئی مجھے کہ وہاں چھاؤں تھی گھنی (۱۳)

اب اس موقعے پر یہ پتا نہیں چلتا کہ ناصر نیند میں کھو گئے یا وہ نیند میں خواب دیکھ رہے تھے یا پھر وقت کو نیند آ گئی اور وہ منظر بدل گیا۔ ہو سکتا ہے کہ وقت کو نیند آ جانے سے مراد یہ ہو کہ وہ خوب صورت شہر تباہ و برباد ہو گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ناصر کی خواہش رہی ہو کہ وہ ایسا کوئی منظر دیکھیں یا پھر دیکھے ہوئے کو انھوں نے بیان کیا ہے۔ بہر حال جو بھی ہے نظم کی روانی اور دل کش اسلوب نے "نشاطِ خواب" کو یادگار تمثال بنا دیا ہے۔

بعض جگہ تو لگتا ہے کہ ناصر غزل کہنے کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ نظم میں بھی اس کے پیوند لگانے سے باز نہ رہ سکے مگر ایک ناصر ہی کا کیا قصور کہ ہمارے ہاں تو کلاسیکی عہد کے اساتذہ بھی نظم میں غزل بلکہ دو غزلے سہ غزلے شامل کر دیتے تھے۔ مثلاً "سحر البیان"، "گلزارِ نسیم" اور "اندر سبھا"۔ چنانچہ "نشاطِ خواب" کو بھی ناصر نے انھی اساتذہ کی تقلید میں مطلع ثانی سے سنوارا ہے اور اس میں اپنی آباؤ اجداد کے ذکر کے ساتھ قطعہ بند اشعار کے پیرایے میں غزل بھی کہہ ڈالی ہے۔ ملاحظہ ہوں دونوں مثالیں:

مطلع ثانی

دل کھینچتی ہے منزلِ آبائے رفتنی
جو اس پہ مر مٹے وہی قسمت کے تھے دھنی
شاہان فقر وہ مرے اجدادِ باکمال
کرتی ہے جن کی خاک بھی محتاج کو غنی
سر خم کیا نہ افسر و لشکر کے سامنے
کس مرتبہ بلند تھی ان کی فروتنی
شب بھر مراقبے میں نہ لگتی تھی ان کی آنکھ
دن کو تلاشِ رزق میں کرتے تھے جاں کنی (۱۴)

اس بند کو پڑھ کے ان کے بزرگوں کی عالی نسبی اور فروتنی دونوں کا احساس ہوتا ہے اور پھر یہ دوسری مثال:

انبالہ ایک شہر تھا، سنتے ہیں اب بھی ہے
میں ہوں اُسی لٹے ہوئے قریے کی روشنی
اے ساکنانِ خطۂ لاہور دیکھنا
لایا ہوں اس خرابے سے میں لعلِ مدنی
جلتا ہوں داغِ بے وطنی سے مگر کبھی
روشن کرے گی نام مرا سوختہ تنی
خوش رہنے کے ہزار بہانے ہیں دہر میں
میرے خمیر میں ہے مگر غم کی چاشنی
یارب! زمانہ ممتحنِ اہلِ صبر ہے
دے اس دنی کو اور بھی توفیق دشمنی

ناصر یہ شعر کیوں نہ ہوں موتی سے آبدار
اس فن میں کی ہے میں نے بہت دیر جانکنی (۱۵)

مطلع ثانی سے جہاں ہمیں ان کے بزرگوں کا پتا چلتا ہے وہیں ناصر کی زندگی کے ذاتی غموں اور ان کی افسردہ دلی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ نظم کا یہ حصہ حقیقت نگاری کی عمدہ مثال ہے اور ہمیں تھوڑا غمگیں بھی کر دیتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ ناصر کاظمی کی یہ نظم ان کے اسلوب اور لہجے کی ایک نئی جہت

سامنے لے کر آتی ہے۔ مصرعے بہت تراشیدہ اور رواں ہیں، لفظوں کی بندش سے مہارت ٹپکتی ہے اور بیان و بدیع کی خوب صورتیاں اس کے حُسن کو بڑھا دیتی ہیں۔ ثابت ہوتا ہے کہ ناصر کو کہانی کہنے کا ہنر اور سلیقہ بھی آتا تھا اور اگر وہ مثنوی کہنے کی طرف مائل ہوتے تو یقیناً کامیاب رہتے۔ دوستوں کی محفل میں وہ ویسے بھی قصہ باز مشہور تھے سو نظموں میں بھی کہانی گھڑ ہی لیتے کہ یہ گُر انھیں خوب آتا تھا۔ مگر ان کا دھیان اس طرف نہیں گیا اور وہ غزل کے ہالے سے نکل ہی نہ سکے تاہم ''نشاطِ خواب''ان کی کسی بھی کامیاب اور مشہور غزل سے کم حُسن نہیں رکھتی۔ اس کی روانی نظم کی سی اور نفاست غزل کی سی ہے۔ ہم یقیناً اسے ان کے ہنر اور فن کا نادر نمونہ قرار دے سکتے ہیں۔

حوالہ جات

ا۔ ناصر کاظمی۔ برگِ نے۔ لاہور: مکتبۂ خیال، ۱۹۸۷ء۔ ص ۲۹۔۳۰

۲۔ ناصر کاظمی۔ دیوان۔ لاہور: مکتبۂ خیال، ۱۹۸۷ء۔ ص ۱۹

۳۔ ناہید قاسمی۔ ناصر کاظمی: شخصیت اور فن۔ لاہور: فضل حق پبلشرز، ۱۹۹۰ء۔ ص ۲۰۱

۴۔ ایضاً۔ ص ۱۷۷

۵۔ ناصر کاظمی۔ نشاطِ خواب۔ لاہور: مکتبۂ خیال، ۱۹۸۷ء۔ ص ۹

۶۔ ایضاً۔ ص ۱۰

۷۔ میر حسن۔ سحر البیان (مرتبہ: رشید حسن خان)۔ دہلی: انجمن ترقیِ اردو ہند، ۲۰۰۰ء۔ ص ۱۹۲۔۱۹۳

۸۔ ایضاً۔ ص ۱۹۶

۹۔ ناصر کاظمی۔ نشاطِ خواب۔ ص ۱۱

۱۰۔ ایضاً۔ ص ۱۲

۱۱۔ میر امن۔ باغ و بہار (مرتبہ: رشید حسن خان)۔ لاہور: نقوش، ۱۹۹۲ء۔ ص ۵۶

۱۲۔ ایضاً۔ ص ۷۷۔۷۸

۱۳۔ ناصر کاظمی۔ نشاطِ خواب۔ ص ۱۳

۱۴۔ ایضاً۔ ص ۱۴

۱۵۔ ایضاً